Tarjihaat
Volume: 1
Issue: III
October 2021
ترجیحات
آن لائن ماہنامہ

صائمہ اقبال، لیکچرار شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد
سعدیہ منیر، اسکالر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

منشایاد کے افسانوں میں تہذیبی عناصر

(افسانوی مجموعوں تماشا، خواب سرائے اور اک کنکر ٹھہرے پانی میں کے حوالے سے)

Abstract:

Minsha Yaad (1935.2011)is one of the most important and highly regarded writers in our literary history.He creative journey is about 1955. During this time Nine fiction collections have come to light.The legends of Mansha Yaad reflect the rural culture and society of Punjab in his stories. The rural life of Central Punjab with its fairs, politics,social,economic and folklore is now an unforgettable part of the cultural history through his stories.In this article we presented cultural review in his three collections "Tamasha" "Khuab Saray" and "Ik kankar Tehry pani main".

Key words: Minsha Yaad, fiction, culture, "Tamasha" "Khuab Saray" and "Ik kankar Tehry pani main".

محمد منشایاد ضلع شیخوپورہ فاروق آباد کے نزدیک ایک گاؤں ٹھٹہ نستر میں ۵ ستمبر ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے۔ منشایاد ہماری ادبی تاریخ کا بہت اہم اور انتہائی لائق توجہ باب ہیں۔ ان کو پنجابی اور اردو زبان پر یکساں عبور حاصل ہے وہ ایک عظیم افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ناول نگار بھی ہیں انہیں پاکستانی ادب کے عصری منظر نامے میں نمایاں حیثیت حاصل ہے انہوں نے ادب میں بنیادی آفاقی قدروں کی ترجمانی کی ہے۔ بہت سی کتب شائع کیں۔ منشایاد ۱۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء کو ۷۵ سال کی عمر میں دل کے دورہ پڑنے سے اپنا خالق حقیقی سے جا ملے۔

اُردو افسانہ یا Short Story افسانوی نثر کی مقبول ترین صنف ہے۔ اردو میں یہ صنف انگریزی ادب سے آئی۔ مختصر افسانہ کیا ہے۔ اس کے بارے میں اُردو لغت بورڈ میں مندرجہ ذیل تعریف درج ہے:

"وہ قصہ، کہانی، داستان، وہ کتاب جس میں کوئی داستان یا قصہ لکھا ہو۔۔۔ ناول کے مقابلے میں ایک مختصر کہانی جس میں زندگی کا کوئی خاص رُخ مختصر طور پر پیش کیا جائے۔"(۱)

اُردو لغت بورڈ کے مطابق افسانہ وہ داستان ہے جو ناول سے چھوٹی ہو اور اُس میں زندگی کا صرف ایک رُخ بیان کیا جائے۔ فرہنگ آصفیہ میں اس کی تعریف ملتی جلتی ہے:

"(۱) حکایتِ بے اصل، قصہ، کہانی و من گھڑت کہانی، گھڑا ہوا قصہ، جھوٹی بات، (۲) سر گزشت، حال، ماجرہ، ذِکر (۳) افسوس، حسرت، پچھتاوا، معلول، (۴) مشہور، شہرت یافتہ۔"(۲)

دنیا کی ہر زبان میں اساطیر و قصص، حکایات و تمثیل اور داستانوں کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ تاہم افسانہ ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو اپنی تاثیر اور جذبات کے اظہار کی شدت کے لحاظ سے ناول اور ناولٹ سے بالکل مختلف اور نمایاں ہے۔ اُردو افسانے کی اب تک مختلف تعریفیں سامنے آچکی ہیں۔ مختصر افسانے میں پلاٹ، کردار اور تھیم یعنی مرکزی خیال شامل ہیں، اور یہ محض قصہ یا مشغلہ نہیں بلکہ یہ حقیقی واقعات پر مبنی ہو سکتے ہیں یا ان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو میں افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوا۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر افسانے میں نئے رجحانات پیدا ہوئے اور اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ افسانہ منشی پریم چند سے چلتا ہوا انتظار حسین تک اور انتظار حسین سے محمد منشایاد تک پہنچا ہے۔

منشایاد جدید اردو افسانے کا ایک اہم اور نمایاں نام ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانے کا آغاز بیسویں صدی کی چھٹی دہائی (۱۹۵۵ء) سے کیا۔ اس وقت بیانیہ اسلوب کا افسانہ علامتیت اور تجریدیت کے دور میں داخل ہو رہا تھا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ جس دور میں افسانے سے کہانی پن ختم ہو رہا تھا انہوں نے کہانی پن کو برقرار رکھا اور وقت کی رو میں بہہ جانے کی بجائے اپنا ایک الگ مقام بنایا۔ اب جبکہ افسانے میں کہانی پن اور ابلاغ واپس آرہے ہیں تو ان کا افسانہ مقبولیت کی سیڑھیاں چڑھتا شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ اور ملکی اور بیرونِ ملکی ادبی اور تعلیمی رسائل ان پر خصوصی گوشے شائع کر کے ان کو خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف زبانوں میں ان کی کہانیوں کے تراجم بھی کیے جا رہے ہیں۔ ان کی اس پذیرائی کا دارومدار ان کے افسانوں کا عمدہ اسلوب اور مخصوص کرافٹ ہے جس نے قارئین کی وسیع تعداد کو تجریدیت اور لغویت سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ اس بات کا اظہار حیدر قریشی نے اپنی کتاب ''حاصلِ مطالعہ'' کے ایک مضمون ''منشایاد کا ''شہرِ افسانہ'' میں اس طرح کیا ہے۔

''منشایاد نے تجریدیت کے تجریدی ماحول میں افسانہ نگاری شروع کر کے خود کو اس میں گم نہیں ہونے دیا بلکہ اس انداز سے کہانی لکھی کہ افسانے سے

گم شدہ کہانی اپنے جسم میں واپس آگئی۔اس لحاظ سے منشایاد کا شمار گنتی کے ان چند
افسانہ نگاروں میں کیا جانا چاہیے جو افسانے میں کہانی پن واپس لانے والے جدید
افسانے کے پیش رو کہلا سکتے ہیں۔''(۳)

منشایاد کا تخلیقی سفر تقریباً پچپن برس(۱۹۵۵ءتا۲۰۱۱ء) ہے۔اس عرصہ میں ان کے نو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔''بند مٹھی میں جگنو''محمد منشایاد کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔جو ۱۹۷۵ء میں ماورا پبلی کیشنز' راولپنڈی سے شا شائع ہوا۔**''ماس اور مٹی''**منشایاد کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔پہلی دفعہ اسے ذاکر شاہ نے ۱۹۸۰ء میں ماڈرن بک ڈپو اسلام آباد سے شائع کیا۔دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔**''خلا اندر خلا''**منشایاد کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔جو پہلی دفعہ ۱۹۳۸ء میں مطبوعات حرمت راولپنڈی سے شائع ہوا۔**''وقت سمندر''**منشایاد کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔جو دسمبر ۱۹۸۶ء میں ماڈرن بک ڈپو اسلام آباد میں شائع ہوا۔منشایاد کا پانچواں افسانوی مجموعہ **''درخت آدمی''** ہے۔یہ ۱۹۹۰ء میں پا کستان بکس،لاہور سے شائع ہوا۔

''دور کی آواز''منشایاد کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۹۴ء میں پاکستان بکس لاہور سے شائع ہوا۔**''تماشا ''**منشایا کا ساتواں افسانوی مجموعہ ہے جو پہلی بار دوست پبلی کیشنز اسلام آباد سے آصف محمود کے تعاون سے شائع ہوا۔**''خوا ب سرائے''**منشایاد کا آٹھواں افسانوی مجموعہ ہے جو ایک ہی بار دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ۔**''اک کنکر ٹھہرے پانی میں''**منشایاد کا نواں افسانوی مجموعہ ہے جو دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۱۰ء میں آصف محمود کے اہتمام سے شائع ہوا۔

منشایاد نے ناول **''ٹاواں ٹاواں تارا''**پنجابی زبان میں ۱۹۹۷ء میں تحریر کیا تھا۔ناول ''راہیں''منشایاد کے پنجابی ناول ''ٹاواں ٹاواں تارا''کا اردو روپ ہے۔منشایاد کے پنجابی افسانوں کا پہلا مجموعہ **''وگدا پانی''** کے نام سے پاکستان پنجابی ادب بورڈ لاہور کے زیر اہتمام پہلی بار ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔

اس نصف صدی میں نہ صرف معاشرے اور ماحول میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں بلکہ اردو افسانہ میں تکنیک ،اسلوب اور فکر کی کئی تبدیلیاں ہوئیں ۔حقیقت سے علامت اور علامت سے تجریدیت اسی دور کی پیدا وار ہے۔منشایاد کے افسانوں میں پنجاب کی دیہی معاشرت کا عکس ملتا ہے انہوں نے یہاں کی سیاست ،معاشرت،اور معیشت سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں اس لیے ان کے افسانے پریم چند،بلونت سنگھ ،غلام الثقلین نقوی اور احمد قاسمی کے افسانوں کی طرح یہاں کی زندگی،رسوم ورواج اور گردو پیش کی فضا کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر آغا سلیم ان کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب ''اشارے''میں لکھتے ہیں:

''دراصل منشایاد کا شمار صفِ اول کے ان افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے جن کی جنم بھومی
دیہات ہے،مگر جنہیں حصولِ معاش کے لیے مجبوراً شہروں میں قیام پذیر ہونا

پڑا۔ شہروں کی طرف نقل مکانی کر جانے والے افسانہ نویسوں نے جب عہدِ رفتہ کو آواز دی تو دیہات اپنی بانہیں سکھولے بے اختیار ان کی جانب بڑھا اور اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ منشایاد کے دیہی پس منظر میں لکھے گئے افسانوں میں بڑی توانا ئی ہے۔"(۴)

ان کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے دیہات کی پیشکش کے رجحان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ وہ پنجاب کی اسی دیہا تی زندگی کی مناسبت سے اُردو زبان میں بڑی مہارت کے ساتھ پنجابی الفاظ و محاورے استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اپنی کتاب "اُردو افسانے کے روایت" میں رقمطراز ہیں:

"پنجاب کے دیہی منظر نامے سے مطابقت رکھنے کے سبب زبان کے ورتاوے سطح پر منشایاد نے پنجابی الفاظ کو موقع کی مناسبت سے برتا ہے۔ اس ضمن میں لسانیات سے خصوصی شغف رکھنے والے ناقدین کیا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ اس کی منشایاد کو پروا نہیں، وہ تو کہانیاں بنتے چلے جا رہے ہیں اور اپنے آپ میں مگن اپنے افسانوی کرداروں کی زندگی سہنے کے جتن میں مبتلا ہیں۔"(۵)

منشایاد نے اپنے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کی غربت، محرومی، قتل و غارت، تعصب، جہالت اور رسم و رواج پر کھل کے بات کی ہے۔ انہوں نے کردار نگاری میں خوب مہارت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنے معاشرے سے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جن کا تعلق نچلے طبقے سے ہے، انہوں نے اپنے افسانوں میں کردار کی ذات میں پیدا ہونے والے طوفان کا نفسیاتی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی کردار نگاری کے حوالے سے ایک عجیب paradox تشکیل پذیر ہوتا ہے کہ منشایاد کرداروں کی کھال میں چھپ کر نہیں بیٹھتا بلکہ کردار ان کے اندر داخل ہو کر اپنا آپ ظاہر کرتے ہیں جن کیفیات سے ان کے کردار گزرتے ہیں وہ ان کو براہ راست محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک ہی زندگی میں ان گنت زندگیاں گزاری ہیں۔ ان کی تحریر میں خلوص، سچائی اور ہمدردی ملتی ہے وہ دوسروں کے درد کو کس طرح محسوس کرتے ہیں ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"مجھے لت پڑ گئی کہ میں خود کو دوسروں کی جگہ رکھ کر دیکھوں۔ ان کی لذتوں، مسرتوں، حسرتوں اور اذیتوں کو محسوس کروں میں نے سینکڑوں روپ بدلے ان گنت قالبوں میں ڈھلا۔ مجھے بہت سی ایسی زندگیوں۔ کے تجربات حاصل ہوتے رہے جو میں نے خود تو نہیں گزاری ہیں میرے اندر دکھوں کی چکی لگی ہو تھی جو دکھوں کا آٹا پیستی رہتی تھی۔ مجھے اچھے، خوبصورت، خوشحال اور بے فکرے لوگوں کی زندگیوں کا لطف نہیں اُٹھانے دیتی تھی گرے پڑے اور مفلوک الحال اور بے توقیر لوگ ہی میر

ے اندر حلول کرتے رہے۔۔۔۔۔۔ میں ریڈیو پر گیت سنتا تو شاعر، گلوکار اور موسیقا
ر سے زیادہ مجھے ان دیکھے سازندوں کا خیال ستاتا رہتا اور ان کا بھی جو اس گیت کی ریکا
رڈنگ اور ریہرسلوں میں پہروں مصروفِ کار رہے مگر جن کے گلے میں سوز تھا اور ہا
تھ میں ساز نہیں۔"(۶)

منشا یاد کی افسانہ نگاری کا یہ وصف ایسا ہے جس سے انکار ممکن نہیں وہ ہماری دنیا کے ہر پہلو کو آسانی سے اپنی گرفت میں لے آتے ہیں ان کے افسانوں میں محسوسات کا ایک خزانہ بکھرا ہوا ہے اور قاری ان خزانوں کو اپنے اندر محسو س کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ابلاغ کے عنصر کو یقینی بنایا ہے کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا افسانہ ابہام کا شکار ہے حالانکہ جس دور میں وہ افسانہ لکھ رہے تھے وہ دور مبہم اور تجریدی افسانے کا دور تھا لیکن انہوں نے ابلاغ اور کہانی پن کا خاص طور پر خیال رکھا۔

انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقائی عمل پر نظر دوڑائیں تو واضح ہوتا ہے کہ بحیثیت قوم یا فرد تہذیب ہمیشہ سے انسانوں کے درمیان شناخت کا ذریعہ رہی ہے۔ تہذیب صدیوں سے انسانی زندگی کا حصہ رہی ہے۔ لفظ تہذیب کی جامع تعریف مختلف اور متنوع انداز میں کی گئی ہے۔ یہ ایک وسیع لفظ ہے جو اپنے اندر بہت سے مفاہیم کو سموئے ہوئے ہے۔ بادی النظر میں اس کا جھکاؤ روحانیت کی طرف زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ کلچر میں ایک انسان کی پوری مادی تہذیب داخل ہے اور دوسری طرف پوری روحانی تہذیب یعنی اس میں صرف کھانا، لباس، گھر، مشینیں اور وسائل مواصلات نقل و حمل ہی نہیں بلکہ مذہب، قانون، اخلاق، فلسفہ، فنون لطیفہ، ادب اور حکومت بھی شامل ہے۔ کلچر کا لفظ تمدن کے مقابلے میں تہذیب کے زیادہ قریب ہے۔ سبط حسن لکھتے ہیں؛

"تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں کسی درخت یا پودے کو کاٹنا،
چھانٹنا، تراشنا تاکہ اس میں نئی شاخیں نکلیں اور نئی کونپلیں پھوٹیں۔"(۷)

کلچر ذہنی، مادی اور خارجی طرز عمل کے اظہار کا نام ہے جو باضابطگی کے ساتھ معاشرے کے افراد میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو ایک معاشرے کو دوسرے معاشرے سے ممیز کرتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"کلچر کا لغوی مفہوم تو کانٹ چھانٹ ہے، جب آپ اپنے پھولوں کی کیاری کو جڑی
بوٹیوں سے پاک کرتے ہیں۔ پودوں کی تراش، خراش کرتے ہیں اور پھولوں کو کچلنے
کے پورے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ تو گویا کلچر کے سلسلے میں پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔۔
بنیادی طور پر انسان کا باطن ایک جنگل کی طرح ہے، جو جذبات کی خاردار جھاڑیوں
سے اٹا پڑا ہے۔ اور جس میں راستہ بنانا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ انسان کے وہ
تخلیقی اقدامات جن کی مدد سے اس نے اپنی ذات کے گھنے جنگل میں راستے بنائے اور

پھر ایک مستقل تراش خراش کے عمل سے ان راستوں کو قائم رکھی، کلچر کے
زمرے میں آتا ہے۔"(۸)

کلچر کسی معاشرے میں بسنے والے انسانوں کے تصور حیات اور ان کی داخلی و خارجی زندگی میں ہم آہنگی، قلبی وابستگی اور تفاخر کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اُردو تنقید میں تہذیب، کلچر، ثقافت، تمدن جیسی اصطلاحات کی صورت میں مباحث ملتے ہیں۔ افسانہ نگار بھی اپنے ماحول کی نمائندگی اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ افسانوں میں اپنے عہد کے مسائل اور مصائب کو نمایاں کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی افسانہ معاشرتی حوالے سے لکھا جائے اور خاص طور پر کسی خاص طبقے یا مذہب کے لوگوں کے بارے میں لکھا جائے تو اس علاقے کی تہذیبی زندگی کا عکس اس افسانے میں نظر آتا ہے۔ محمد منشایاد کی افسانہ نگاری حقیقت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ انہوں نے جس سرزمین پر آنکھ کھولی اسی کے مسائل، رسوم وغیرہ کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانے پنجاب کی دیہی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ وسطی پنجاب کی دیہی زندگی یہاں کے میلے ٹھیلے، سیاست، معاشرت، معیشت اور لوک دانش ان کی کہانیوں کے ذریعے اب اردو ادب کی تہذیبی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔ اب ہم ان کے افسانوں کا تہذیبی جائزہ لیتے ہیں۔

''تماشا'' منشایا کا ساتواں افسانوی مجموعہ ہے جو پہلی بار دوست پبلی کیشنز اسلام آباد سے آصف محمود کے تعاون سے شائع ہوا۔ اس کا سرورق خالد رشید نے ترتیب دیا ہے اس مجموعے کا نام معروف افسانہ ''تماشا'' کے نام پر رکھا گیا ہے وہ اس کتاب میں شامل نہیں ہے۔ آیئے اب ہم اس مجموعہ کے منتخب افسانوں دیدہ یعقوب تماشا کل اور آج کا تہذیبی مطالعہ کرتے ہیں۔

''دیدہ یعقوب'' اس افسانہ میں ایک باپ اپنے بیٹے کا انتظار کرتا ہے۔ اور اس انتظار میں وہ اس کے بچپن کے تمام واقعات کو یاد کرتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ وہ اپنے باپ سے اپنے تعلق کو بھی یاد کرتا ہے جس سے دو نسلوں کا تفاوت سامنے آتا ہے۔

پنجابی گیت ہماری تہذیب کا ایک اہم عنصر ہیں۔ افسانہ **''دیدہ یعقوب''** میں مرکزی کردار جب اپنے بیٹے کو یاد کر رہا ہوتا ہے۔ تو اسے اپنے ماں باپ بھی یاد آجاتے ہیں۔ اس کی ماں اس کے آنے کی خوشی میں اندر باہر آتے جاتے وقت، کھانا بناتے وقت اور بستروں کی چادریں ٹھیک کرتے وقت مولوی عبدلستار کا ستوارہ گنگناتی رہتیں۔ اس حوالہ سے اس افسانہ سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''اس روز ماں جی اندر باہر جاتے، ہنڈیا میں ڈوئی چلاتے اور بستروں کی چادریں اور
> تکیوں کے غلاف بدلتے ہوئے مولوی عبدالستار کا ستوارہ گنگناتی رہتیں۔
> چھن چھن وار اداسی ہوئی کیوں نئی آیا یار میاں
> نین میرے بھر ہنجوروون کر کے زار وزار میاں

غم سنیار چھکے جند میری جیوں بارے وچ تار میاں
آکھ ستار رٹھوں کس کارن ایہہ دنیا دن چار میاں''۔(۹)

منشایاد نے اپنے افسانوں میں پنجابی گیتوں کا استعمال کر کے ایک نیا تاثر پیدا کیا ہے۔ ہر ماں کو اپنے بیٹے کے آنے کی بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے اور وہ بہت بے چینی سے اس کا انتظار کرتی ہے اس کے لیے طرح طرح کے کھانے بناتی ہے۔

افسانہ **''دیدہ یعقوب''** کا موضوع والدین کی اپنی اولاد سے محبت اور اولاد کی والدین سے محبت ہے۔ انتظار میں کرب اور اذیت جیسے جذبات کو منشایاد نے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی کا یہ ایک خاص وصف ہے کہ وہ کردار کے اندر کی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔

''تماشا۔ کل اور آج'' کا مرکزی کردار ''سائیں ٹوبھے شاہ'' ہے جس کے بارے میں بہت عجیب و غریب قصے مشہور تھے۔ جیسا کہ ان کے قبضے میں جنوں کا لشکر تھا۔ جن سے جنگل صاف کروا کر انہوں نے یہ بستی اور زمین کو قابل کاشت بنایا تھا۔ اسی طرح کے اور بھی بہت قصے مشہور تھے۔ گاوں کے لوگ اپنے سادہ پن کی وجہ سے اس کی تمام باتوں پر یقین رکھتے تھے۔

ہمارے معاشرے میں اکثر پیر فقیر اپنی عجیب و غریب کرامات بتاتے ہیں۔ گائوں کے لوگ سادہ لوح لوگ ان کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ ان جعلی پیروں کی کرامات کے متعلق افسانہ ''تماشا۔ کل اور آج'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں :

> ''دن کو وہ لنگوٹی پہنے اس تالاب کے کنارے بیٹھے رہتے تھے اور چاروں طرف عقید ت مندوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ رات کو تالاب میں ٹبی مار جاتے اور رات بھر تالاب کی تہہ میں بیٹھ کر چلہ کشی کرتے اور صبح سے پہلے باہر آکر درخت کے نیچے بیٹھ جاتے ۔دن کے وقت جب جی چاہتا، تالاب میں کود جاتے اور بڑی دیر تک اوپر نہ آتے ۔''(۱۰)

منشایاد نے اپنے افسانوں میں تقریباً زندگی کے تمام پہلوئوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے اکثر افسانوں کا موضوع دیہات اور اس سے وابستہ مسائل ہیں۔ اس افسانہ میں منشایاد نے دیہاتی زندگی خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ دیہاتی لوگ تعلیم کی کمی کی وجہ سے پیروں فقیروں پر بہت جلدی یقین کر لیتے ہیں۔ اس افسانے کا پلاٹ بہت سادہ ہے اور تمام کردار بھی نارمل ہیں سوائے سائیں ٹوبھے کے۔ اس افسانوی مجموعے کے بیشتر افسانے بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے افسانے سماجی اور اشتراکی حقیقت پسندی کے نمائندہ دکھائی دیتے ہیں۔

''خواب سرائے'' منشایاد کا آٹھواں افسانوی مجموعہ ہے جو ایک ہی بار دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعے کا دیباچہ ''نصف صدی کا قصہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس مجموعے میں بائیس افسانے

اور ''مٹھی بھر جگنو'' کے عنوان سے متعدد افسانچے شامل ہیں۔اب ہم اس مجموعہ کے منتخب افسانوں کہانی کی رات، کرمو ں والی اور ہاری ہوئی جیت کا تہذیبی مطالعہ کرتے ہیں۔

''کہانی کی رات'' میں ایک دادا اپنے پوتوں کو مختلف ہندو دیومالا اور بچوں کی کہانیوں سے مواد لے کر کہانی سناتا ہے کہ ایک جادوگر نے اپنی جان طوطے میں قید کی ہوتی ہے اور پھر بچے اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے ہیں۔کہانی کی صورت میں سیاستدانوں پر طنز کیا گیا ہے۔

ہمارے دیہاتی کلچر میں ابھی بھی زیادہ تر فیصلے پنچایت کے ذریعے ہی ہوتے ہیں اسی طرح افسانہ۔''خواب کی رات'' میں جب اس کا مرکزی کردار اپنے باپ اور بچوں کے ساتھ گاڑی میں جارہا ہوتا ہے تو شاہراہ ''جمہوریت'' سے گزرتے وقت اس کے ابّاجی کو اپنے گاؤں کی پنچایت کا ایک واقعہ یاد آجاتا ہے۔اس حوالہ سے افسانہ ''خواب کی رات'' میں سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''مجھے اپنے گاؤں کی پنچایت کا ایک واقعہ یاد آگیا ہے۔''
>
> ''کیا''
>
> کہنے لگے ''گاؤں کی پنچایت میں بڑے اچھے فیصلے ہوا کرتے تھے۔لیکن ایک بار ایسا ہوا کہ سرپنچ کے اپنے لڑکے نے ساتھیوں کی مدد سے ایک غریب جلاہے کے کنبے کو بے عزت اور زدکوب کیا اور اس کا گھر جلاڈالا اور ساتھ ہی موقع پر موجود لوگوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے ان کے خلاف گواہی دی تو ان کا بھی یہی حشر ہوگا۔جلاہا اپنا مقدمہ پنچایت میں لے کر گیا۔پنچایت نے نہایت توجہ اور ہمدردی سے اس کی فریاد اور چشم دید گواہوں کے بیانات سنے۔سر جوڑ کر بیٹھی رہی اور آخر کار یہ فیصلہ دیا کہ اس میں شک نہیں ہوگا گا موجولاہے کا گھر جلادیا گیا اور اس کے بال بچوں کو مارا پیٹا گیا جس کا پنچایت کو بہت افسوس ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ موقعہ پر موجود لو گ مجرموں کو پہچان نہ سکے کہ آگ اور فساد کے خوف سے دور کھڑے تھے''۔(۱۱)

ہمارے معاشرے میں ایسا ہی ہوتا ہے غریب کو کبھی بھی انصاف نہیں ملتا کیونکہ انصاف کرنے والے خود ان ظالموں کے ساتھ ہوتے ہیں۔اس افسانے میں منشایاد نے آج کل کے سیاستدانوں پر طنز کیا ہے۔اس کہانی کا کردار ابّاجی جو کہانی سناتا ہے اگر اس غور کیا جائے تو اس سے یہ بات ہمارے علم میں آتی ہے کہ آج کل کے سیاستدان اپنی دولت بیرون ملک بنکوں میں محفوظ کرتے ہیں جس طرح جادوگر اپنی جان طوطے میں پنجرے کے اندر قید کرلیتا ہے۔

''کرموں والی'' کی بیان کنندہ حج سے واپسی پر ہوائی جہاز میں بھاگی کی بیٹی نائلہ کو دیکھتی ہے جو کہ اس کے تایا کی بیٹی سعدیہ آپا کی دوست اور ہمسایہ تھی۔ان دونوں کا دکھ ایک جیسا تھا وہ دونوں جوانی میں ہی بیوہ ہو جاتی ہیں۔بھاگی کے

چھوٹے چھوٹے بچے تھے گائوں کے کچھ لوگ اس کی مدد کر دیا کرتے تھے اور اس کے تایا جی بھی حسب توفیق اس کی مدد کرتے تھے۔ پھر اس کے تایا کی بھینس زہریلی گھاس کھانے کی وجہ سے مر جاتی ہے اور اس کی ایک چھوٹی بچھڑی ہوتی ہے۔ تو اس کی آپا کی سفارش سے وہ بچھڑی بھاگی کو دے دیتے ہیں۔ وہ اور اس کے بچے ایک اعلیٰ نسل کی کٹڑی پا کر بہت خوش ہو تے ہیں۔ اور اس کی بہت دیکھ بھال کرتے ہیں پھر جب وہ بچھڑی دیتی ہے تو ان کے دن پھر جاتے ہیں۔

پھر اس کی تایازاد کو حسد کی آگ نے گھیر لیا اور اس نے بھاگی کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا بھاگی پنچائت سے سچ بولتی رہی لیکن کسی نے بھی اس کی ایک نہ سنی۔ پیار و محبت کی طرح نفرت اور حسد بھی ہماری ثقافتی اقدار میں پائے جاتے ہیں ۔ حسد کسی بھی انسان کے غم و غصہ کا اظہار ہے۔ نفرت اور حسد ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو اندر سے توڑ دیتی ہیں اور اس کی بدولت ہر اچھی چیز بھی بُری لگنے لگتی ہے۔ افسانہ ''کرموں والی'' میں جب سعدیہ آپا بھاگی کی بھینس کو دیکھتی ہے تو حسد کی آگ میں جلنے لگتی ہے اور وہ بھاگی کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیتی ہے اور پنچائت بھی اس کے حق میں فیصلہ دیتی ہے اور بیچا ری بھاگی کی کوئی بھی نہیں سنتا اور پھر جب اسے بھاگی کی بد دعا سے طلاق ہو جاتی ہے تو وہ پھر اس بات کا اقرار کر لیتی ہے کہ اس نے یہ سب غصے اور حسد میں کیا تھا۔ اس حوالہ سے افسانہ ''کرموں والی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''ہاں بعد میں جب انہیں واقعی طلاق ہو گئی تو وہ ہل گئیں اور انہیں یقین ہو گیا کہ وہ ضرور کینسر ہی سے مریں گی۔ انہوں نے اعتراف کر لیا کہ یہ سب انہوں نے غصے اور حسد میں کیا تھا۔''(۱۲)

حسد انسان کو اندر ہی اندر کھا جاتا ہے جب انسان نفرت اور حسد کی عینک سے دیکھتا ہے تو اسے ہر اچھائی بھی بُری لگنے لگتی ہے کو نکہ جب حسد کے جذبات ہمارے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں تو ہم اسی جذبے کے زیرِ اثر رویوں کو پرکھتے ہیں۔ اس افسانہ میں دیہاتی زندگی کی پیچیدگیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

''ہاری ہوئی جیت'' کا مرکزی کردار گھر سے اپنی بیٹی کی شادی کی تاریخ لینے کے لیے جاتا ہے اور۔ واپسی پر اس کی ٹرین حادثے کا شکار ہو جاتی ہے جس میں وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ منزل ہماری تہذیب کا ایک نمایاں پہلو ہے ہر ذی روح کسی نہ کسی منزل کی تلاش میں ہے اور اس کی طرف رواں دواں ہے۔ منزل پر پہنچنے کی خواہش کی تکمیل میں اسے بہت سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی اس کی حصول منزل کی جستجو اسے اپنی طرف گامزن رکھتی ہے افسانہ ''ہاری ہوئی جیت'' کا مرکزی کردار ٹرین میں بیٹھتا ہے تو اس میں بیٹھا ہوا ہر شخص جلدی سے اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے۔ اس حوالہ سے افسانہ ''ہاری ہوئی جیت'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''جب انجن آکر گاڑی سے لگا وہ بہت سی چیزیں نیچ چکا اور اب میزان کرنے میں مصروف تھا۔ زور کا دھکا لگنے سے منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ بعض دوسرے مسا فر جو غفلت اور بے خیالی میں بیٹھے تھے سیٹوں سے نیچے گر گئے۔ مگر زیادہ تر مسافروں

کو یہ دھکا خوش گوار معلوم ہوا اس کا مطلب تھا انتظار ختم ہوا اور منزل کی طرف روانہ ہونے کا وقت آگیا۔

ہر مسافر کو اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔''(۱۳)

یہ حقیقت ہے کہ ہر کسی کو اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے اور وہ جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ دعا عبادت کا مغز ہے اور ہماری تہذیب و ثقافت میں نمایاں اہمیت رکھتی ہے دعا کی ہمارے معاشرے میں بہت اہمیت ہے یہ دعا ہی ہے جو تقدیر بدل دیتی ہے۔ دعا زندگی کی علامت ہے۔ افسانہ ''ہاری ہوئی جیت'' میں جب ٹرین چلتی ہے تو مسافر اپنے سفر کا آغاز دعائوں سے کرتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگتے ہیں۔ اس حوالہ سے افسانہ ''ہاری ہوئی جیت'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''ہر مسافر کو اپنی پر منزل پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے اور وہ اپنے سفر کا آغاز دعائوں سے کرتا ہے۔ بعض دور اندیش اور ہوشیار آدمی اللہ سے اگلے پچھلے سارے گناہوں کی معافی مانگ لیتے اور آئندہ کے لیے توبہ بھی کر لیتے۔''(۱۴)

اکثر ایسا ہے ہوتا ہے کہ جب بھی ہم سفر کرتے ہیں تو بہت سے ایسے مسافر ہوتے ہیں جو اللہ سے یہ سوچ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیتے ہیں کہ کہیں یہ ان کا آخری سفر نہ ہو۔ اس مجموعے میں زیادہ تر افسانے سماجی حقیقت نگاری کے کے تحت تحریر کیے گئے ہیں ان میں علامتی اور استعاراتی انداز بھی اپنایا گیا ہے۔

''اک کنکر ٹھہرے پانی میں'' منشایاد کا نواں افسانوی مجموعہ ہے جو دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۱۰ء میں آصف محمود کے اہتمام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں چودہ افسانے ہیں۔ اور ''مٹھی بھر جگنو'' کے نام سے متعدد افسانچے شامل ہیں۔ اور آخر میں منشایاد کا ''منٹو کے نام خط'' شامل کیا گیا ہے جو انہوں نے ۱۰ فروری ۲۰۰۸ میں منعقدہ سیمینار بعنوان ''منٹو۔ ہمارا ہم عصر'' میں پڑھا تھا۔ اب ہم اس مجموعہ کے منتخب افسانوں بیل کہانی اور پنجرے میں بسیرا کا تہذیبی مطالعہ کرتے ہیں۔

''بیل کہانی'' کی کہانی ایک بیل کے گرد گھومتی ہے یہ ایک ایسا بیل ہے جو طاقت کے نشے میں دھت ہے اور جب اس پر سرکاری مہر لگ جاتی ہے تو اور بھی زیادہ بد دماغ ہو جاتا ہے اور کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ جو کوئی بھی اس کے راستہ میں آتا ہے وہ اسے کچل دیتا ہے، شرفو تیلی کا تو وہ دشمن ہی بن جاتا ہے اور جہاں کہیں بھی اسے دیکھ لیتا ہے تو اسے مارنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک نہ ایک دن ہر جاندار نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ایک دن جب وہ ریل کی پٹری پر چل رہا ہوتا ہے تو شرفو کو دیکھ کر بیل غصے اور انتقام کی آگ میں بھڑک اُٹھتا ہے اور اس کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ شرفو اس کے ساتھ ایک چال چلتا ہے اس کے اور گاڑی کے درمیان فاصلہ دیکھ کر آرام سے ریلوے ٹریک پر چلتا رہتا ہے اور جب گاڑی اس کے بہت قریب آجاتی ہے تو وہ ایک طرف ہو جاتا ہے۔

ہندو مذہب میں گائے کو بہت مقدس سمجھا جاتا ہے اور وہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔افسانہ ''بیل کہانی'' میں جب اس کا مرکزی کردار اپنے بھتیجے کو کہتا ہے کہ میں تمہیں شرفو تیلی اور اور اس کا بیل کی کہانی سناتا ہوں کہانی سناتے ہوئے وہ اسے ذیلدار کے بیٹے کے بارے میں بھی بتاتا ہے کہ اس کی پالتو گائے جس کی بیماری کی وجہ سے اس کے ملازم نے اسے ذبح کرنے کی صلاح دی تھی وہ یہ سن کر اسے بہت مارتا ہے۔ پھر وہ ہندو مذہب پر بات شروع کر دیتے ہیں کہ وہ گائے کو بہت مقدس مانتے ہیں۔اس حوالہ سے افسانہ ''بیل کہانی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''ہندو مذہب میں شروع ہی سے گائے اور بیل کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔''

''اصل بات یہ ہے چچا جی کہ گائے چونکہ دودھ دیتی ہے اور بچھڑے پیدا کرتی تھی اور بیل ہل ،رہٹ ،خراس اور بردباری کی گاڑی کھینچتے تھے ،اس لیے قدیم زرعی معاشرے میں مویشیوں اور نسبتاً َصاف ستھرا ہونے کے سبب۔خاص طور پر گائے اور بیل کو بہت اہمیت حاصل تھی۔''(۱۵)

ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر گاءِ کی پوجا بھی کرتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ گائے اور بیل ہل ،بیل گاڑیاں اور بار برداری کی گاڑیاں کھینچتے تھے اس لیے مقدس سمجھے جاتے تھے آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر ہندو اور مسلمانوں میں گائے کی وجہ سے جھگڑا رہتا ہے کیونکہ ہم مسلمان اس کی قربانی کرتے ہیں اور اس کا گوشت کھاتے ہیں جبکہ ہندو اس کی پوجا کرتے ہیں۔

گاؤں کے لوگ تعلیم کی کمی وجہ سے بہت زیادہ ضعیف العقیدہ ہوتے ہیں اور بھوت پریت کی باتوں پر بہت جلد یقین کر لیتے ہے۔افسانہ ''بیل کہانی'' میں جب قبرستان سے کاٹے گئے درختوں کی نیلامی ہوتی ہے تو لکڑیوں سے بھرا ہوا چھکڑا جب پُل سے گزر رہا ہوتا ہے تو بند ہو جاتا ہے پھر بیل وہاں آجاتا ہے اور وہ اس لکڑیوں سے بھرے ہوئے چھکڑے کو بہت ٹکریں مارتا ہے اور وہ لکڑیوں سمیت نیچے کھائی میں گر جاتا ہے۔اور گاؤں کے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ سب ان بزرگوں کی وجہ سے ہے جن کی قبریں اس قبرستان میں ہیں۔اس حوالہ سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''گاؤں کے کچھ لوگوں کو اس واقعہ کا افسوس بھی تھا مگر زیادہ تر لوگ جو قبرستان کے درخت کاٹے جانے کے خلاف تھے ،اندر سے خوش بھی تھے۔ان کا خیال تھا کہ یہ سب ان پیروں فقیروں کی ناراضی اور بددعا کی وجہ سے ہوا تھا جن کی قبروں کے آس پاس کے درخت کاٹے گئے تھے بلکہ بعض ضعیف العقیدہ یقین رکھتے تھے کہ سانڈ سرکاری تو بہانہ تھا ،اصل کرامت تو ان بزرگوں کی تھی جن کی وہاں قبریں تھیں ۔''(۱۶)

گاؤں کے لوگ بہت جلد ضعیف العقیدہ باتوں کو مان لیتے ہیں چاہے ان میں سچائی ہو یا نہ ہو یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چھکڑا کے اندر کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو لیکن ان لوگون نے اس بات پر یقین کر لیا کہ یہ سب ان بزرگوں کی وجہ سے ہوا جن کی قبریں قبرستان میں تھیں۔

یہ ایک علامتی افسانہ ہے اور اس میں بیل کو علامت کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی کسی کے پاس کوئی اختیا رآجاتا ہے خواہ انسان ہو یا جو تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور دوسروں کو اپنے پائوں کی دھول سمجھتا ہے۔

''سوالوں میں گھرا ہوا آدمی'' کا مرکزی کردار ''بھولا'' جو نئی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور اپنے باپ سے ہر چیز کے متعلق مختلف قسم کے سوال پوچھتا رہتا ہے۔اس کا باپ اس کی اس عادت سے پریشان ہوتا ہے۔ ''بھولا'' تجسّس اور حقیقت کا متلاشی ہوتا ہے۔وہ بے در پے سوال پوچھ کے اپنے بزرگ والد کو پریشان کرتا ہے۔

لیلۃ القدر ایک ایسی رات ہے جس کی عبادت کا ثواب ہزار راتوں کے برابر ہے، ہم مسلمان اس رات کو عبادت کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور مساجد میں بہت رش ہوتا ہے سب لوگ اس رات کو نوافل ادا کرتے ہیں اللہ کے حضور گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اپھر امام مسجد دعا بھی منگواتے ہیں۔افسانہ ''سوالوں میں گھرا ہوا آدمی'' میں ''بھولا'' اور اس کا والد ستائیسویں رمضان کو مسجد میں عبادت کے لیے جاتے ہیں۔اس حوالہ سے افسانہ ''سوالوں میں گھرا ہوا آدمی '' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''اگلے روز ستائیسویں رمضان تھی لیلۃ القدر۔ برکت اور عبادت کی رات ہم طرح طرح کے پکوان کھا کر قریبی مسجد میں پہنچے تو تل دھرنے کی جگہ نہ تھی ہمارے امام صا حب کی دعا کی دور دور تک شہرت تھی اس لیے دوسرے محلوں اور مضافات سے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ ہمیں بڑی مشکل سے بیرونی صحن میں جگہ ملی۔ نمازِ عشا کے بعد امام صاحب نے دیر تک شبِ قدر کی فضیلت بیان کرتے رہے۔ پھر سب کو گ نوا فل پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔رات بارہ بجے دعا شروع ہوئی اور ڈیڑھ بجے کے قریب ختم ہوئی۔''(۱۷)

لیلۃ القدر کی رات ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگ ساری رات اللہ کی عبادت کرتے ہیں نوافل ادا کرتے ہیں اور مسجدوں میں بہت رش ہوتا ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔اس افسانہ میں ''بھولا'' تجسّس اور حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔ اس طرح وہ نئی نسل کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہے جو بے در پے سوال کر کے پرانی نسل کو پریشان کرتا ہے۔

''پنجرے میں بسیرا'' میں ملک کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔اس افسانہ میں موجودہ دور میں ہونے والی دہشت گردی اور عدم تحفظ کی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار اس دہشت گردی کی وجہ سے اپنی ماں کا آخری دیدار کرنے سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔ ٹھپے، دوہڑے اور ماہیے ہماری پنجابی تہذیب کا ایک اہم پہلو

ہیں۔افسانہ ''پنجرے میں بسیرا'' کا مرکزی کردار ''پرویز'' جب دہشت گردی کی وجہ سے اپنی ماں کا آخری دیدار کرنے سے محروم رہ جاتا ہے تو وہ رات کو حافظ کا دوہڑا پڑھ پڑھ کر خود بھی روتا ہے اور اپنے دوست کو بھی رُلاتا ہے۔اس حوالہ سے افسانہ ''پنجرے میں بسیرا'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''رات کو وہ حفظ کا دوہڑا پڑھ پڑھ کر خود بھی روتا اور ہمیں بھی رلاتا رہا۔

''وقت جنازے آیا نئیں' لنگھ آویں وقت دفن دے۔۔۔۔۔۔ول ڈیکھ گھنٹی تیڈی آمد
تیکھل ویسن بند کفندے
ڈُکھ ٹلسِن عالم برزخ دے لنگھ ویسن وقت امن دے۔۔۔۔۔ جُل آکھسوں حافظؔ روحا
ں کوں ہن لکھ احسان سجن دے''۔(۱۸)

منشایاد نے اپنے افسانوں میں پنجابی دوہڑے اور الفاظ کا استعمال کر کے ایک نیا تاثر پیدا کیا ہے۔

اس مجموعے کے افسانے زیادہ تر سماجی سطح پر موجود برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان برایوں کو بیان کرنے کے لیے منشایاد نے علامتی اسلوب اختیار کیا ہے۔ محمد منشایاد کے فن کے اعتراف میں بہت کام ہو چکا ہے مگر میں سمجھتی ہو ں کہ ابھی ان کے فن پر مزید کام ہو سکتا ہے ان کے ہاں بہت اچوتی اور انوکھی تشبیہات اور استعارات کا بھرپور استعمال ہے اس پر اگر الگ سے کام کروایا جائے تو بہت سود مند رہے گا۔ منشایاد اپنے عہد کی سچی آواز ہیں۔انہوں نے اپنے لفظوں کی حرمت کو قائم رکھتے ہوئے اپنے ہم عصروں میں ایک نمایاں اور انفرادی مقام حاصل ہے آپ کے فن کا اظہار نہ صرف قو می بلکہ بین الاقوامی سطح پر کیا جاتا ہے

حوالہ جات

۱۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد اول، کراچی: ترقی اُردو بورڈ، ۱۹۷۷ء، ص ۶۱۳
۲۔ احمد دہلوی، سید، مولوی، فرہنگ آصفیہ، جلد اول، دوم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۸۶
۳۔ حیدر قریشی، حاصلِ مطالعہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص، ۸۵
۴۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، اشارے، راولپنڈی نقش گر پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۸۴
۵۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت، اسلام آباد: اکادمی دبیات، ص ۹۸
۶۔ منشایاد، خلا اندر خلا، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد: ۲۰۱۰، ص ۱۰
۷۔ سبطِ حسن، سید، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، کراچی: کتب پرنٹرز پبلشرز، ۱۹۷۵ء، ص ۹۰
۸۔ وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، لاہور: جدید ناشرین، ۱۹۶۵ء، ص ۱۵۴
۹۔ منشایاد، میں اپنے افسانوں میں تمہیں پھر ملوں گا، اسلام آباد: نیشنل بک فائونڈیشن، ۲۰۱۱ء، ص ۶۰۳

۱۰۔ ایضاً :ص۶۰۵

۱۱۔ ایضاً :ص۶۴۲

۱۲۔ ایضاً:ص۶۸۲

۱۳۔ ایضاً :ص۷۰۹

۱۴۔ ایضاً:ص،۷۱۱

۱۵۔ منشایاد،اک کنکر ٹھہرے پانی میں، کراچی: دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء:ص۲۵

۱۶۔ ایضاً :ص۱۳۳

۱۷۔ ایضاً :ص۱۷۶

۱۸۔ ایضاً:ص،۱۸۶